اپنی جگہ پر بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا دیا اور ابھی مسز سیبوک کمرہ ہی میں تھیں کہ وہ اپنا اخبار پڑھنے لگیں۔

مسز سیبوک صوفیہ کے پاس گئیں تو وہ تیار تھی۔ کتابوں کے بنڈل بندھے ہوئے تھے۔ کئی خادمائیں ادھر ادھر انعام کے لالچ میں کھڑی تھیں۔ دل مین خوش تھیں کہ کسی طرح بلا ٹلی۔ صوفیہ بہت اداس تھی۔ اس گھر کو چھوڑتے ہوئے اس کو بہت رنج ہو رہا تھا۔ اسے اپنی منزل مقصود کا پتہ نہ تھا۔ اسے کچھ معلوم نہ تھا کہ تقدیر کہاں لے جائے گی۔ کیا کیا اذیتیں اٹھانی پڑیں گی۔ کشتی حیات کس گھاٹ لگے گی۔ اسے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ ونے سنگھ سے پھر ملاقات نہ ہوگی۔ ان سے ہمیشہ کے لیے جدا ہو رہی ہوں۔ رانی صاحبہ کی اہانت آمیز گفتگو، ان کا شکوہ اور اپنی غلطی سب کچھ بھول گئی۔ دل کے ایک تار سے یہ آواز نکل رہی تھی کہ اب ونے سے پھر ملاقات نہ ہو گی۔ مسز سیبوک بولیں۔ ''کنور صاحب سے بھی مل لوں۔''

صوفیہ ڈر رہی تھی کہ کہیں ماما کو رات کے واقعہ کی خبر نہ مل جائے۔ کنور صاحب کہیں مذاق ہی مذاق میں کہہ نہ ڈالیں۔ بولی۔ ''ان سے ملنے میں دیر ہوگی پھر مل لیجیے گا۔''

مسز سیبوک: پھر کسے اتنی فرصت ہے۔

دونوں کنور صاحب کے دیوان خانہ میں پہنچیں۔ وہاں اس وقت والنٹیروں کا ہجوم تھا۔ گڑھوال میں سخت قحط پڑا ہوا تھا۔ نہ اناج تھا نہ پانی۔ جانور مر رہے تھے۔ پر انسانوں کو موت بھی نہ آتی تھی۔ ایڑیاں رگڑتے تھے اور سسکتے تھے۔ یہاں سے پچاس والنٹیروں کا ایک دستہ ان غمزدوں کی امداد کرنے کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔ اس وقت کنور صاحب ان کا انتخاب کر رہے تھے۔ انہیں ضروری باتیں سمجھا رہے تھے۔ ڈاکٹر گنگولی نے اس بڑھاپے میں ان کا سردار ہونا منظور کر لیا تھا۔ دونوں اصحاب اس قدر مشغول تھے کہ مسز سیبوک کی طرف کسی نے دھیان نہ کیا۔ آخر وہ بولیں۔ ''ڈاکٹر صاحب! آپ کا کب جانے کا ارادہ ہے؟''

کنور صاحب نے مسز سیوک کو دیکھا اور بڑے تپاک سے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ خیر و عافیت دریافت کی اور لے جا کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔ صوفیہ اپنی ماں کے پیچھے جا کر کھڑی ہوگئی۔

کنور صاحب: یہ لوگ گڑھوال جا رہے ہیں۔ آپ نے اخباروں میں پڑھا ہوگا۔ وہاں لوگوں پر کتنی زبردست مصیبت آ پڑی ہے۔

مسز سیوک: خدا ان لوگوں کو اپنے پاک مقصد میں کامیاب کرے۔ ان کے ایثار کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ میں دیکھتی ہوں یہاں ان کی خاصی تعداد ہے۔

کنور صاحب: مجھے اتنی امید نہ تھی۔ ونے کی باتوں پر یقین نہ آتا تھا۔ سوچتا تھا اتنے والنٹیر (خدام وطن) کہاں ملیں گے۔ سبھوں کو نوجوانوں کی پست ہمتی کا رونا روتے ہوئے دیکھتا تھا۔ ان میں جوش نہیں ہے۔ ایثار نہیں ہے۔ جان نہیں ہے۔ سب اپنے اپنے ذاتی غرض کے نشہ میں متوالے ہو رہے ہیں۔ کتنی ہی سیوا سمتیاں قائم ہوئیں پر ایک بھی سرسبز نہ ہوئی، لیکن اب مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ لوگوں کو ہمارے نوجوانوں کے بارے میں کتنا وہم ہوا تھا۔ اب تک تین سو نام درج ہو چکے ہیں۔ کچھ لوگوں نے تمام عمر قومی خدمت کی انجام دہی کا عہد کیا ہے۔ ان میں کئی اشخاص تو ہزاروں روپے ماہوار کی آمدنی پر لات مار کر آئے ہیں۔ ان لوگوں کا حوصلہ دیکھ کر مجھے بہت کچھ امید ہوگئی ہے۔

مسز سیوک: مسٹر کلارک کل آپ کی بڑی تعریف کر رہے تھے۔ خدا نے چاہا تو آپ کو جلد ہی ''سی آئی ای'' کا خطاب ملے گا اور مجھے آپ کو مبارک باد دینے کا موقع۔

کنور صاحب: (شرما کر) میں اس اعزاز کے قابل نہیں ہوں۔ مسٹر کلارک مجھے اس قابل سمجھتے ہیں تو یہ ان کا حسن ظن ہے۔ مسز سیوک! تیار رہنا۔ کل تین بجے کی میل سے یہ لوگ روانہ ہوں گے۔ پربھو نے بھی آنے کا وعدہ کیا ہے۔

مسز سیبوک: صوفی تو آج گھر جا رہی ہے (مسکرا کر) شاید آپ کو عنقریب ہی اس کا کنیا دان دینا پڑے۔ مسٹر کلارک جال پھیلا رہے ہیں۔

صوفیہ شرم سے گڑ گئی۔ اس کو ماں کے اوچھے پن پر غصہ آ رہا تھا۔ اس بات کا ڈھنڈورا پیٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ کیا یہ سمجھتی ہیں کہ مسٹر کلارک کا نام لینے سے کنور صاحب رعب میں آ جائیں گے۔

کنور صاحب: بڑی خوشی کی بات ہے۔ صوفی دیکھو ہم لوگوں کو اور خصوصاً اپنے غریب بھائیوں کو بھول نہ جانا۔ تمہیں ایشور نے جتنا اچھا دل عطا کیا ہے ویسا ہی اچھا موقع مل رہا ہے۔ ہماری دعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ رہیں گی۔ تمہارے احسان سے ہم کبھی سبکدوش نہیں ہو سکتے۔ کبھی کبھی ہم لوگوں کو بھی یاد کرتی رہنا۔ مجھے پہلے معلوم نہ تھا ورنہ آج اندو کو ضرور بلا بھیجتا۔ خیر ملک کی حالت تم پر واضح ہے۔ مسٹر کلارک بہت ہی ہونہار آدمی ہیں۔ ایک دن ضرور یہ اس ملک کے کسی صوبہ کے حاکم ہوں گے۔ میں یقین کے ساتھ یہ پیشین گوئی کر سکتا ہوں۔ اس وقت تم اپنے اثر، اختیار اور اپنی قابلیت سے ملک کو بہت کچھ نفع پہنچا سکو گی۔ تم نے اپنے اہالیان ملک کی حالت دیکھی ہے۔ ان کی مفلسی کا تمہیں پورا احساس ہے۔ ان کی حالت کی اصلاح میں اسی احساس سے کام لینا۔

صوفیہ شرم کی وجہ سے کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی ماں نے کہا۔ ''آپ رانی صاحبہ کو ضرور ساتھ لائیے گا۔ میں کارڈ بھیجوں گی۔''

کنور صاحب: نہیں۔ مسز سیبوک! مجھے معاف کیجیے گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس تقریب میں شریک نہ ہو سکوں گا۔ میں نے عہد کیا ہے کہ میں حکام سے علاقہ نہ رکھوں گا۔ حکام کی نظر التفات ہم لوگوں کو دانستہ یا نادانستہ طریقہ پر خود پسند اور خود مختار بنا دیتی ہے۔ میں اپنے کو اس آزمائش میں نہیں ڈالنا چاہتا کیونکہ مجھے اپنے اوپر اعتماد نہیں ہے۔ میں اپنی قوم میں حاکم و محکوم، ادنیٰ و اعلیٰ کی تفریق نہیں رکھنا چاہتا۔ ہم

سب محکوم ہیں۔ شاہ بھی محکوم ہے اور گدا بھی۔ جھوٹے اقتدار کے غرور میں اپنا سر نہیں پھرانا چاہتا۔

مسز سیبوک: خدا نے آپ کو راجہ بنایا ہے۔ راجوں ہی کے ساتھ راجہ کا میل ہو سکتا ہے۔ انگریز لوگ بابوؤں کو منہ نہیں لگاتے، کیونکہ اس سے یہاں کے راجاؤں کی توہین ہوتی ہے۔

ڈاکٹر گنگولی: مسز سیبوک۔ یہ بہت دنوں تک راجہ رہ چکا ہے۔ اب اس کا جی بھر گیا ہے۔ میں اس کا بچپن کا ساتھی ہوں۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ پڑھتے تھے۔ دیکھنے میں یہ مجھ سے چھوٹا معلوم ہوتا ہے۔ پر کئی سال بڑا ہے۔

مسز سیبوک: (ہنس کر) ڈاکٹر کے لیے یہ تو کوئی فخر کی بات نہیں ہے۔

ڈاکٹر: ہم دوسروں کا دوا کرنا جانتا ہے۔ اپنا دوا کرنا نہیں جانتا۔ کنور صاحب اسی بکھت (وقت) سے Pessimist (مایوس المزاج) ہے۔ اسی وجہ سے اس کے پڑھنے میں رکاوٹ پڑی۔ اب بھی اس کا وہی حال ہے۔ ہاں اب تھوڑا پھیر پھار ہو گیا ہے۔ پہلے فعل سے بھی مایوسی پسند تھا اور قول سے بھی۔ اب اس کے قول و فعل میں یکسانیت نہیں ہے۔ قول سے تو اب بھی ویسا ہی ہے، پر کام وہ کرتا ہے جسے کوئی پکا Optimist (امید پر بھروسہ رکھنے والا) ہی کر سکتا ہے۔

کنور صاحب: گنگولی! تم میرے ساتھ بے انصافی کر رہے ہو۔ مجھ میں پر امید ہونے کے اوصاف ہی نہیں ہیں۔ ایسا شخص پر ماتما کا بھگت ہوتا ہے۔ پکا گیانی۔ پورا رشی۔ اس کو چاروں طرف پر ماتما ہی کا جلوہ نظر آتا ہے۔ اسی وجہ سے اس کو مستقبل پر بے اعتمادی نہیں ہوتی۔ میں شروع ہی سے تن آسانیوں کا غلام رہا ہوں۔ وہ روحانی علم نہیں حاصل کر سکا جسے امید کی کنجی کہنا چاہیے۔ میرے لیے نا امیدی (Pessimism) کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔ مسز سیبوک! ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا خلاصہ صرف ایک لفظ ایثار ہے۔ ان پر جتنی مصیبتیں نازل ہوئیں وہ کسی

عارف کامل کو بھی دہریہ بنا کر چھوڑتیں۔ جس شخص کے سات بیٹے جوان ہو ہو کر دنیا سے اٹھ جائیں، لیکن وہ اپنے فرض کی ادائیگی میں ذرا بھی کوتاہی نہ کرے۔ ایسی مثال مشکل ہی سے کہیں ملے گی۔ ان کی ہمت ٹوٹنا تو جانتی ہی نہیں۔ صدمات کی چوٹیں انہیں اور بھی ٹھوس بنا دیتی ہیں۔ میں کم ہمت اور کمزور شخص ہوں۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی حکمران قوم محکوم قوم کے ساتھ انصاف اور مساوات کا برتاؤ کر سکتا ہے۔ انسانی فطرت کو میں کسی ملک میں کسی وقت بھی اس قدر بے لوث اور بے غرض نہیں پاتا جس قوم نے ایک بار اپنی آزادی کھو دی، وہ پھر اس درجہ کو نہیں حاصل کر سکتی تھی۔ غلام ہی اس کی تقدیر ہو جاتی ہے، لیکن ہمارے ڈاکٹر صاحب انسانی فطرت کو اتنا خودغرض نہیں سمجھتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ خونخوار جانوروں کے دل میں بھی ازلی نور کی شعاعیں موجود رہتی ہیں۔ صرف پردہ ہٹانے کی ضرورت ہے۔ میں انگریزوں کی طرف سے مایوس ہو گیا ہوں۔ برخلاف اس کے ان کو کامل یقین ہے کہ ہندوستان کی نجات انگریزوں ہی کے ذریعہ ہو سکتی ہے اور ہو گی۔

مسز سیبوک: (روکھے پن سے) تو کیا آپ یہ نہیں مانتے کہ انگریزوں نے ہندوستان کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ شاید کسی قوم نے کسی ملک یا قوم کے ساتھ نہ کیا ہو؟

کنور صاحب: نہیں۔ میں یہ نہیں مانتا۔

مسز سیبوک: (تعجب سے) تعلیم کی اتنی اشاعت اور بھی کسی زمانہ میں ہوئی؟

کنور صاحب: میں اسے تعلیم نہیں کہتا جو انسان کو سراپا خودغرض بنا دے۔

مسز سیبوک: ریل، تار، ڈاک، جہاز یہ ساری کرامتیں انگریزوں ہی کے ساتھ آئیں۔

کنور صاحب: انگریزوں کے بغیر بھی آ سکتی تھیں اور اگر آئی بھی ہیں تو زیادہ انگریزوں ہی کے فائدہ کے لیے۔

مسز سیوک: ایسا قانون پہلے کبھی نہ تھا۔

کنور صاحب: بجا ہے۔ ایسا قانون کہاں تھا جو نا انصافی کو انصاف اور جھوٹ کو سچ ثابت کر دکھائے۔ یہ انصاف نہیں۔ انصاف کا گورکھ دھندا ہے۔

دفعتاً رانی صاحبہ کمرہ میں آئیں۔ صوفیہ کا چہرہ انہیں دیکھتے ہی فق ہو گیا۔ وہ کمرہ کے باہر نکل گئی۔ رانی کے سامنے کھڑی نہ ہو سکی۔ مسز سیوک کو بھی اندیشہ ہوا کہ کہیں چلتے چلاتے رانی سے پھر نہ بات بڑھ جائے۔ وہ بھی باہر چلی گئیں۔ کنور صاحب نے دونوں کو فٹن پر سوار کرایا۔ صوفیہ نے آب دیدہ ہو کر کنور صاحب کو دست بستہ سلام کیا۔ فٹن چل دی۔ آسمان پر کالی گھٹائیں چھائی ہوئی تھیں۔ فٹن سڑک پر تیزی سے دوڑی چلی جاتی تھی اور صوفیہ رو رہی تھی۔ اس کی حالت اس بچے کی سی تھی جو روٹی کھاتا ہوا مٹھائی والے کی آواز سن کر اس کے پیچھے دوڑے۔ ٹھوکر کھا کر گر پڑے۔ پیسہ ہاتھ سے نکل جائے اور وہ روتا ہوا گھر لوٹ جائے۔

(15)

راجہ مہیندر کمار سنگھ اگرچہ اصولی معاملہ میں حکام سے ذرا بھی نہ دبتے تھے، لیکن فروعی امور میں وہ خواہ مخواہ ان کی مخالفت کرنا محض بیکار ہی نہیں بلکہ قوم کے لیے مضر خیال کرتے تھے۔ ان کو میانہ روی پر جتنا بھروسہ تھا، اتنا پیش دستی پر نہ تھا۔ خصوصاً اس لیے کہ موجودہ حالات گردوپیش کے ہوتے ہوئے جو کچھ خدمت کر سکتے تھے وہ حکام کا اعتماد رکھ کر ہی کر سکتے تھے۔ اس لیے انہیں کبھی کبھی مجبور ہو کر وہ طریقہ اختیار کرنا پڑتا جس سے انتہا پسندوں کو ان پر انگشت نمائی کا موقع مل جاتا تھا۔ ان میں اگر کوئی کمزوری تھی تو یہ کہ وہ عزت کے بھوکے تھے اور ایسے دیگر انسانوں کی طرح وہ اکثر مصلحت کے نقطہ خیال سے نہیں بلکہ شہرت طلسمی کے خیال سے اپنا طرز عمل قائم کرتے تھے۔ پہلے انہوں نے انصاف کا پہلو لیتے ہوئے جان سیوک کو سورداس کی زمین دلانے سے انکار کر دیا تھا مگر اب ان کو اس کے خلاف کام کرنے کے لیے مجبور

ہونا پڑ رہا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو سمجھانے کے لیے تو پانڈے پور والوں کو طاہر علی کے گھر میں گھسنے پر آمادہ ہونا ہی کافی تھا، لیکن دراصل جان سیوک اور مسٹر کلارک کی باہمی رفاقت نے ہی انہیں اپنا پہلا فیصلہ پلٹ دینے کی ترغیب دی تھی، لیکن ابھی انہوں نے بورڈ میں اس تجویز کو پیش نہ کیا تھا۔ یہ شک ہوتا تھا کہ کہیں لوگ مجھ پر ایک دولتمند سوداگر کی جانبداری کا الزام نہ لگائیں۔ ان کی عادت تھی کہ بورڈ میں کوئی تجویز رکھنے سے پہلے وہ اندو سے یا اس کی عدم موجودگی میں اپنے کسی دوست سے مشورہ کرلیا کرتے تھے۔ ان کے سامنے اپنی بات کو ثابت کرتے ہوئے ان کے شکوک کو رفع کرنے کی کوشش کر کے اپنا اطمینان کر لیتے تھے۔ اگرچہ ان کے ارادہ میں اس بحث مباحثہ سے کوئی فرق واقع نہ ہوتا بلکہ وہ اپنی بات پر قائم رہتے۔ تاہم گھنٹہ دو گھنٹہ کے تبادلہ خیالات سے ان کو بہت تسکین ملتی تھی۔

سہ پہر کا وقت تھا۔ سمتی کے والنٹیر گڑھوال جانے کے لیے اسٹیشن پر جمع ہو رہے تھے۔ اندو نے گاڑی تیار کرنے کا حکم دیا۔ اگرچہ مطلع ابر آلود ہو رہا تھا اور لمحہ بہ لمحہ آسمان سیاہ تر ہوتا جا رہا تھا، لیکن والنٹیروں کو رخصت کرنے اسٹیشن پر جانا ضروری تھا۔ رانی صاحبہ نے اس کو بہت اصرار کے ساتھ طلب کیا تھا۔ وہ جانے کو تیار تھی کہ راجہ صاحب اندر آئے اور اندو کو جانے پر تیار دیکھ کر بولے۔ ''کہاں جاتی ہو؟ بادل گھرا ہوا ہے۔''

اندو: سیوا سمتی کے لوگ گڑھوال جا رہے ہیں۔ انہیں رخصت کرنے اسٹیشن جا رہی ہوں۔ اماں جی نے بلایا بھی ہے۔

راجہ: پانی ضرور برسے گا۔

اندو: پردہ ڈال لوں گی اور بھیگ بھی گئی تو کیا آخر وہ بھی تو انسان ہیں جو قومی خدمت کے لیے اتنی دور جا رہے ہیں۔

راجہ: نہ جاؤ تو کوئی ہرج ہے؟ اسٹیشن پر مجمع زیادہ ہوگا۔

اندو: ہرج کیا ہوگا۔ میں جاؤں یا نہ جاؤں وہ لوگ تو جائیں گے ہی، لیکن دل نہیں مانتا۔ وہ لوگ گھر بار چھوڑ کر جا رہے ہیں۔ نہ جانے کتنی تکلیفیں برداشت کریں گے۔ نہ جانیں کب لوٹیں گے۔ مجھ سے اتنا بھی نہ ہو کہ انہیں رخصت کر آؤں۔ آپ بھی کیوں نہیں چلتے؟

راجہ: (متحیر ہو کر) میں؟

اندو: ہاں ہاں۔ آپ کے جانے میں کوئی ہرج ہے؟

راجہ: میں ایسی جماعتوں میں شریک نہیں ہوتا۔

اندو: کیسی جماعتوں میں؟

راجہ: اسی قسم کی جماعتوں میں۔

اندو: کیا سیوا سمتیوں سے ہمدردی رکھنا بھی قابل اعتراض ہے؟ میں تو سمجھتی ہوں کہ ایسے مبارک کاموں میں شریک ہونا کسی کے لیے بھی شرم یا اعتراض کا سبب نہیں ہو سکتا۔

راجہ: تمہاری اور میری سمجھ میں بہت فرق ہے۔ اگر میں بورڈ کا صدر نہ ہوتا تو میں حکومت کا ایک رکن نہ ہوتا۔ اگر میں ریاست کا مالک نہ ہوتا تو آزادی سے ہر ایک جمہوری تحریک میں حصہ لیتا۔ موجودہ حالت میں میرا کسی ایسی جماعت میں شریک ہونا اس بات کا ثبوت سمجھا جائے گا کہ حکام کو بھی اس جماعت سے ہمدردی ہے۔ میں اس غلط خیال کی اشاعت نہیں کرنا چاہتا۔ سیوا سمتی نوجوانوں کی جماعت ہے اور اگرچہ اس وقت اس نے خدمت عامہ کا معیار اپنے سامنے رکھا ہے اور وہ اسی خدمت کے راستہ پر چلنے کی آرزو رکھتی ہے، لیکن تجربہ نے ثابت کر دیا ہے کہ خدمت یا فیض رسانی ایسی شکل اختیار کر لیتی ہے جسے کوئی حکومت مقبولیت کی نظر سے نہیں دیکھ سکتی اور علانیہ یا پوشیدہ طریقوں سے اس کو برباد کر دینے کی کوشش کرنی پڑتی ہے۔ میں۔۔ اتنی بڑی ذمہ داری اپنے سر نہیں لینا چاہتا۔

اندو: تو آپ اس عہدہ سے سبکدوش کیوں نہیں ہو جاتے؟ اپنی آزادی کا خون کیوں کرتے ہیں؟

راجہ: صرف اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ شہر کا انتظام جتنی خوبی سے میں کر سکتا ہوں اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اہل شہر کی خدمت کا ایسا عمدہ اور کمیاب موقع پا کر میں اپنی آزادی کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا۔ میں ایک ریاست کا راجہ ہوں اور فطرتاً میری ہمدردی سرکار کے ساتھ ہے۔ مساوات اور جمہوریت کو جائیداد سے دشمنی ہے۔ میں اس وقت تک جمہوریت کا ساتھ نہ دوں گا جب تک میں اپنی جائیداد سے دست بردار ہو جانے کا ارادہ نہ کر لوں۔ میں قول سے جمہوریت کا پیرو بن کر اپنے فعل سے اس کا مخالف نہیں بننا چاہتا۔ قول و فعل میں اتنا زبردست اختلاف ہونا میرے لیے ناقابل برداشت ہے۔ میں ان لوگوں کو فریبی اور مکار سمجھتا ہوں جو اپنی جائیداد سے مستفید ہوتے ہوئے جمہوریت کی دہائی دیتے پھرتے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جمہوریت کے دیوتا کے پجاری بن کر وہ کس منہ سے عظیم الشان محلوں میں رہتے ہیں۔ موٹر کشتیوں میں سوار ہو کر دریا کی سیر کرتے ہیں اور دنیا کی نعمتوں کا دل کھول کر لطف اٹھاتے ہیں۔ اپنے کمرہ سے فرش ہٹا دینا اور سادی پوشاک پہن لینا ہی جمہوریت نہیں ہے۔ یہ بے حیائی اور دغابازی ہے۔ اپنے دسترخوان کے بچے کھچے ٹکڑوں کو غریبوں کے سامنے پھینک دینا جمہوریت کا منہ چڑانا ہے، اسے بدنام کرنا ہے۔

یہ حملہ کنور صاحب پر تھا۔ اندو سمجھ گئی۔ تیوریاں بدل گئیں، لیکن اس نے ضبط سے کام لیا اور اس ناخوشگوار قضیہ کو تمام کرنے کے لیے بولی۔ ''مجھے دیر ہو رہی ہے، تین بجنے والے ہیں۔ ساڑھے تین بجے گاڑی چھوٹتی ہے۔ اماں جی سے ملاقات ہو جائے گی۔ ونے کی خیر و عافیت کا حال بھی معلوم ہو جائے گا۔ ایک پنتھ دو کاج ہو گا۔''

راجہ: جن وجوہ سے میرا جانا نا مناسب ہے انہیں وجوہ سے تمہارا جانا بھی مناسب نہیں۔تم جاؤیا میں جاؤں۔ایک ہی بات ہے۔

اندو اسی پاؤں اپنے کمرہ میں واپس آئی اور سوچنے لگی، یہ ظلم نہیں تو اور کیا ہے۔ زبردست ظلم! کہنے کو میں رانی ہوں مگر اتنا اختیار بھی نہیں کہ گھر سے باہر جاسکوں۔ مجھ سے تو لونڈیاں ہی اچھی ہیں۔دل بہت مغموم ہوگیا۔آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔اس نے گھنٹی بجائی اور لونڈی سے کہا۔''گاڑی کھلوا دو۔میں اسٹیشن نہیں جاؤں گی۔''

مہیندر کمار بھی اس کے پیچھے ہی کمرہ میں آ کر بولے۔''کہیں سیر کیوں نہ کر آتیں؟''

اندو:نہیں بادل گھرا ہوا ہے۔بھیگ جاؤں گی۔

راجہ: کیا ناراض ہوگئیں؟

اندو:ناراض کیوں ہوں؟ آپ کی لونڈی ہوں آپ نے حکم دیا نہ جاؤ نہ جاؤں گی۔

راجہ: میں تمہیں مجبور نہیں کرنا چاہتا۔اگر میری باتوں کو جان لینے کے بعد بھی تمہیں وہاں جانے میں کوئی قابل اعتراض بات نہیں معلوم ہوتی تو شوق سے جاؤ۔میرا مقصد صرف تمہاری معقولیت پسندی کی تحریک سے تھا۔میں انصاف طاقت سے روکنا چاہتا ہوں،حکم کی طاقت سے نہیں۔بولو اگر تمہارے جانے سے میری بدنامی ہوتو تم جانا چاہوگی؟

یہ چڑیا کے پر کاٹ کر اسے اڑانا تھا۔اندو نے اڑانے کی کوشش ہی نہ کی۔اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہوسکتا تھا۔''ہرگز نہیں۔یہ میرے دھرم کے خلاف ہے۔''لیکن اندو پر اپنی مجبوری اتنی کھل رہی تھی کہ اس نے اس سوال کو سنا ہی نہیں یا سنا بھی تو اس نے ان سنا کر دیا۔اس کو ایسا معلوم ہوا کہ یہ میرے زخم پر نمک چھڑک

رہے ہیں۔ اماں اپنے دل میں کیا کہیں گی۔ میں نے بلایا اور نہیں آئی۔ کیا دولت کی ہوا لگ گئی۔ کس طرح معافی مانگوں۔ اگر لکھوں کہ طبیعت ناساز ہے تو وہ ابھی یہاں آ پہنچیں گی اور مجھے شرمندہ ہونا پڑے گا۔ آہ اب تو وہاں پہنچ گئی ہوتی۔ پربھوسیوک نے بہت پراثر نظم لکھی ہوگی۔ دادا جی کا وعظ بھی معرکہ کا ہوگا۔ ایک ایک لفظ محبت اور رغبت میں ڈوبا ہوا! والنٹیر لوگ اپنی خوشنما وردیوں میں کتنے خوبصورت معلوم ہوتے ہوں گے۔

اس قسم کے خیالات نے اندو کو اس قدر خواہش مند بنا دیا کہ وہ ضد کرنے پر آمادہ ہوگئی۔ میں تو جاؤں گی۔ بدنامی نہیں پتھر ہوگی۔ یہ سب مجھے روک رکھنے کے بہانے ہیں۔ تم ڈرتے ہو ڈرو۔ اپنے کرموں کے پھل بھوگو گے۔ میں کیوں ڈروں۔ اپنے دل میں یہ خیالات کرتے ہوئے اس نے مصمم لہجہ میں کہا۔ ''آپ نے مجھے جانے کی اجازت دے دی ہے، میں جاتی ہوں۔''

راجہ نے بے دلی سے کہا۔ ''تمہاری مرضی جانا چاہتی ہو تو شوق سے جاؤ۔''

اندو چلی گئی تو راجہ صاحب سوچنے لگے۔ عورتیں کتنی بے درد، کتنی خود پسند اور کتنی ضدی ہوتی ہیں۔ چلی جا رہی ہیں۔ گویا میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ اس کا ذرا بھی خیال نہیں کہ حکام کے کانوں تک یہ خبر پہنچے گی تو وہ مجھے کیا کہیں گے۔ اخبارات کے نامہ نگار یہ خبر ضرور رہی لکھیں گے اور وہاں جانے والی عورتوں میں چتاری کی رانی کا نام جلی حروف میں لکھا ہوا نظر آئے گا۔ میں جانتا کہ اتنی ضد کریں گی تو منع ہی کیوں کرتا۔ خود بھی ساتھ جاتا۔ ایک طرف بدنام ہوتا تو دوسری طرف نیک نام۔ اب تو دونوں طرف سے گیا۔ ادھر بھی برا بنا اور ادھر بھی۔ آج معلوم ہوا کہ عورتوں کے سامنے محض صاف گوئی سے کام نہیں چلتا۔ وہ راضی رہتی ہیں تو دل جوئی سے!

اندو اسٹیشن کی طرف چلی، لیکن جوں جوں آگے بڑھتی تھی، اس کا دل ایک بوجھ سے دبا جاتا تھا۔ میدان میں جسے ہم فتح کہتے ہیں، گھر میں اسی کا نام کج خلقی۔ بے

مروتی اور نا اہلیت ہے۔ اندو کو اس فتح پر غرور نہ تھا۔ اپنی ضد کا ملال تھا۔ سوچتی جاتی تھی۔ وہ مجھے اپنے دل میں کتنی خودسر و مغرور سمجھ رہے ہوں گے کہ جب یہ ذرا ذرا سی باتوں میں یوں آنکھیں پھیر لیتی ہے، ذرا ذرا سے اختلافات میں یوں لڑنے پر آمادہ ہو جاتی ہے تو کسی نازک موقع پر اس سے ہمدردی و غمگساری کی کیا توقع کی جا سکتی ہے۔ اماں جی یہ حال سنیں گی تو مجھی کو بھلا برا کہیں گی۔ بے شک مجھ سے غلطی ہوئی۔ واپس چلوں اور ان سے اپنی اس غلطی کے لیے معافی مانگوں۔ میرے سر پر نہ جانے کیوں بھوت سوار ہو جاتا ہے۔ خواہ مخواہ الجھ پڑی۔ بھگوان! مجھے کب اتنی عقل آئے گی کہ ان کی مرضی پر سر جھکانا سیکھوں گی۔

اندو نے باہر کی طرف سر نکال کر دیکھا۔ اسٹیشن کا سگنل نظر آ رہا تھا۔ عورتوں اور مردوں کا ایک انبوہ اسٹیشن کی طرف دوڑتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ سواریوں کا تانتا لگا ہوا تھا۔ اس نے کوچوان سے کہا۔ ''گاڑی پھیر دو۔ میں اسٹیشن نہ جاؤں گی۔ گھر واپس چلو۔''

کوچوان نے کہا۔ ''سرکار! اب تو آ گئے۔ وہ دیکھئے۔ کئی آدمی مجھے اشارتاً کہہ رہے ہیں کہ گھوڑوں کو پڑھاؤ۔ گاڑی پہنچاتے ہیں۔''

اندو: کچھ پروا نہیں۔ فوراً گھوڑے پھیر دو۔

کوچوان: کیا سرکار کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی کیا؟

اندو: بک بک مت کرو۔ گاڑی واپس لے چلو۔

کوچوان نے گاڑی پھیر دی۔ اندو نے ایک لمبی سانس لی اور سوچنے لگی۔ سب لوگ میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ گاڑی دیکھتے ہی پہچان گئے تھے۔ اماں کتنی خوش ہوئی ہوں گی۔ پر گاڑی کو لوٹتے دیکھ کر انہیں اور دوسرے لوگوں کو کتنا تعجب ہوا ہو گا۔ کوچوان سے کہا۔ ''ذرا پیچھے منہ پھیر کر دیکھو۔ کوئی آ تو نہیں رہا ہے؟''

کوچوان: حضور۔ کوئی گاڑی تو آ رہی ہے۔

اندو: گھوڑوں کو تیز کر دو۔ سرپٹ چھوڑ دو۔

کوچوان: حضور گاڑی نہیں۔ موٹر ہے۔ صاف موٹر ہے۔

اندو: گھوڑوں کا چابک لگاؤ۔

کوچوان: حضور یہ تو اپنی ہی موٹر معلوم ہوتی ہے۔ ہینگن سنگھ چلا رہے ہیں۔ خوب پہچان گیا۔ اپنی ہی موٹر ہے۔

اندو: پاگل ہو۔ اپنی موٹر کیوں آنے لگی؟

کوچوان: حضور۔ اپنی موٹر نہ ہو تو جو چور کی سزا وہ میری۔ صاف نظر آ رہی ہے۔ وہی رنگ ہے۔ ایسی موٹر اس شہر میں دوسری ہے ہی نہیں۔

اندو: ذرا غور سے دیکھو۔

کوچوان: کیا دیکھوں۔ حضور۔ وہ آ پہنچی۔ سرکار بیٹھے ہیں۔

اندو: خواب تو نہیں دیکھ رہا ہے!

کوچوان: لیجیے حضور۔ یہ برابر آ گئی۔

اندو نے گھبرا کر باہر دیکھا تو سچ مچ اپنی ہی موٹر تھی۔ گاڑی کے برابر پہنچ کر وہ رک گئی اور راجہ صاحب اتر پڑے۔ کوچوان نے گاڑی روک دی۔ اندو نے حیرت سے پوچھا۔ ''آپ کب آ گئے؟''

راجہ: تمہارے آنے کے پانچ منٹ بعد میں بھی چل پڑا۔

اندو: راستہ میں تو کہیں نہیں دکھائی دیئے۔

راجہ: لائن کی طرف سے آیا ہوں۔ ادھر کی سڑک خراب ہے۔ میں نے سمجھا ذرا چکر تو پڑے گا مگر جلد پہنچوں گا۔ تم اسٹیشن کے سامنے سے کیسے لوٹ آئیں؟ کیا بات ہے؟ طبیعت تو اچھی ہے؟ میں تو گھبرا گیا۔ آؤ۔ موٹر پر بیٹھ جاؤ۔ اسٹیشن پر گاڑی آ گئی ہے۔ دس منٹ میں چھوٹ جائے گی۔ لوگ ملنے کے خواہش مند ہیں۔

اندو: اب میں نہ جاؤں گی۔ آپ تو پہنچ ہی گئے تھے۔

راجہ: تمہیں چلنا پڑے گا۔

اندو: مجھے مجبور نہ کیجیے۔ میں نہ جاؤں گی۔

راجہ: پہلے تو تم یہاں آنے کے لیے اتنی بے قرار تھیں۔ اب کیوں انکار کر رہی ہو؟

اندو: آپ کی مرضی کے خلاف آئی تھی۔ آپ نے میری خاطر اپنے اصول کو توڑ دیا تو میں کس منہ سے وہاں جا سکتی ہوں۔ آپ نے مجھے ہمیشہ کے لیے رواداری کا سبق دے دیا۔

راجہ: میں ان لوگوں سے تمہیں لانے کا وعدہ کر آیا ہوں۔ تم نہ چلو گی تو مجھے کتنا مجبوب ہونا پڑے گا۔

اندو: آپ خواہ مخواہ اصرار کر رہے ہیں۔ آپ کو مجھ سے ناراض ہونے کا یہ آخری موقع تھا۔ اب پھر اتنی جرأت نہ کروں گی۔

راجہ: انجن سیٹی دے رہا ہے۔

اندو: ایشور کے لیے مجھے جانے دیجیے۔

راجہ نے مایوس ہو کر کہا۔ ''جیسی تمہاری مرضی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اور تمہارے ستاروں میں کوئی فطری نامناسبت ہے جو ہر وقت اپنا اثر دکھلاتی رہتی ہے۔ ''

یہ کہہ کر وہ موٹر پر سوار ہو گئے اور بڑی تیزی سے اسٹیشن کی طرف چلے۔ فٹن بھی آگے بڑھی۔ کوچوان نے پوچھا کہ حضور گئیں کیوں نہیں۔ سرکار برا مان گئے۔

اندو نے اس کا کچھ جواب نہ دیا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ کیا مجھ سے پھر غلطی ہوئی۔ کیا میرا جانا مناسب تھا۔ کیا وہ سچے دل سے میرے جانے کے لیے اصرار کر رہے تھے یا ایک تازیانہ لگانا چاہتے تھے۔ ایشور ہی جانے۔ وہی عالم الغیب ہے۔ میں کسی کے دل کی بات کیا جانوں۔

گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھتی جاتی تھی۔ آسمان پر چھائے ہوئے بادل پھٹ

رہے تھے، لیکن اندو کے دل پر چھائی ہوئی گھٹا لمحہ بہ لمحہ زیادہ گھنی ہوتی جا رہی تھی۔

''آہ۔ کیا واقعی ہمارے ستاروں میں کوئی فطری نامناسبت ہے جو قدم قدم پر ہمارے ارادوں کو پامال کرتی رہتی ہے؟ میں کتنا چاہتی ہوں کہ ان کی مرضی کے خلاف ایک قدم بھی نہ چلوں مگر یہ طالع کی نحوست مجھے ہمیشہ زک دیتی ہے۔ اگر وہ صاف دلی سے اصرار کر رہے تھے تو میرا انکار سراسر بیجا تھا۔ آہ انہیں میرے ہاتھوں دکھ پہنچا۔ انہوں نے اپنی جبلی شرافت سے مجھے معاف کر دیا اور میری دل جوئی کے لیے اپنے اصول کی پروانہ کی۔ سمجھے ہوں گے اکیلی جائے گی تو لوگ خیال کریں گے کہ شوہر کی مرضی کے خلاف آئی ہے ورنہ کیا وہ بھی نہ آتے۔ مجھے اس الزام سے بچانے کے لیے انہوں نے اپنے اوپر اتنا جبر کیا۔ میری حماقت سے وہ کس قدر مایوس ہوئے ہیں ورنہ ان کے منہ سے یہ جملہ کبھی نہ نکلتا۔ میں سچ مچ ابھاگنی ہوں۔''

انہیں افسوس ناک خیالات میں ڈوبی ہوئی وہ چندر بھون پہنچی اور گاڑی سے اتر کر سیدھی راجہ صاحب کے دیوان خانہ میں جا بیٹھی۔ آنکھیں چرا رہی تھی کہ کسی نوکر چاکر سے سامنا نہ ہو جائے۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میرے چہرہ پر کوئی داغ لگا ہوا ہے۔ جی چاہتا تھا کہ راجہ صاحب آتے ہی آتے مجھ پر بگڑنے لگیں۔ مجھے خوب آڑے ہاتھوں لیں۔ جگر کو طعنوں کے تیروں سے چھلنی بنا دیں۔ یہی ان کی صاف دلی کا ثبوت ہوگا۔ اگر وہ آ کر مجھ سے میٹھی میٹھی باتیں کرنے لگیں تو سمجھ جاؤں گی کہ میری طرف سے ان کا دل صاف نہیں۔ بلکہ یہ سب محض ظاہر داری ہے۔ وہ اس وقت اپنے شوہر کی سخت گیری کی خواہشمند تھی۔ گرمیوں میں کسان بارش کا نہیں بلکہ حدت کا بھوکا ہوتا ہے۔

اندو کو بہت دیر تک انتظار نہ کرنا پڑا۔ پانچ بجتے بجتے راجہ صاحب آ پہنچے۔ وہ دروازہ پر کھڑی ہوگئی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔ راجہ صاحب اس کو دیکھتے ہی محبت آمیز لہجہ میں بولے۔ ''تم نے آج قومی سرگرمی کا ایک بے مثل نظارہ دیکھنے کا موقع

کھو دیا۔ بڑا ہی دلکش منظر تھا۔ کوئی ہزار آدمیوں نے جس وقت جانے والوں پر پھول برسائے تو ساری زمین پھولوں سے ڈھک گئی۔ والنٹیروں کا قومی گانا تو اتنا پر اثر کہ تماشائی مست ہو گئے۔ میرا دل قومی غرور سے اچھلنے لگا۔ بار بار یہی افسوس ہوتا تھا کہ تم نہ ہوئیں۔ یہی سمجھ لو کہ میں اس لطف کا اظہار نہیں کر سکتا۔ میرے دل میں سیوا سمتی کے متعلق جتنے شکوک تھے وہ سب رفع ہو گئے۔ یہی جی چاہتا تھا کہ میں بھی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس جماعت کے ساتھ چلا جاتا۔ ڈاکٹر گنگولی کو اب تک میں بالکل بکواسی سمجھتا تھا۔ آج میں ان کا حوصلہ دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ تم نے سخت غلطی کی۔ تمہاری ماتا جی بار بار پچھتاتی تھیں۔''

اندو کو جس بات کا خوف تھا وہ پوری ہو گئی۔ سوچا کہ یہ سب ظاہر داری ہے۔ ان کا دل صاف نہیں ہے۔ یہ مجھے بیوقوف سمجھتے ہیں اور بیوقوف بنانا چاہتے ہیں۔ اس شیریں بیانی کے پردہ میں کتنی تلخی چھپی ہوئی ہے۔ چڑھ کر بولی۔ ''میں جاتی تو آپ کو ضرور برا معلوم ہوتا۔''

راجہ: (ہنس کر) محض اس لیے کہ میں نے تمہیں جانے سے روکا تھا؟ اگر مجھے برا معلوم ہوتا تو میں خود ہی کیوں جاتا؟

اندو: معلوم نہیں۔ آپ کیا سمجھ کر گئے۔ شاید مجھے خفیف کرنا منظور تھا۔

راجہ: اندو۔ اتنی بدگمان نہ ہو۔ سچ کہتا ہوں مجھے تمہارے جانے کا ذرا بھی ملال نہ ہوتا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ مجھے پہلے تمہاری ضد بری معلوم ہوئی، لیکن جب میں نے غور کیا تو مجھے اپنا طرز عمل بالکل غیر مناسب معلوم ہوا۔ میں نے خیال کیا کہ تمہاری آزادی میں اس حد تک مخل ہونا میری زیادتی ہے۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے کی غرض سے میں اسٹیشن گیا۔ تمہاری وہ بات میرے دل میں بیٹھ گئی کہ حکام کے دلوں میں اپنا وقار قائم رکھنے کے لیے اپنی آزادی کا خون کیوں کرتے ہو۔ نیک نام رہنا اچھی بات ہے، لیکن نیک نامی کے لیے سچی باتوں میں دبنا اپنے ضمیر کا خون

کرنا ہے۔ اب تو تمہیں میری باتوں کا یقین ہوا؟

اندو: آپ کی دلیلوں کا جواب میں نہیں دے سکتی، لیکن آپ سے التجا کرتی ہوں کہ جب مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہو تو آپ مجھے تنبیہ کریں اور ملامت کریں۔ جرم اور سزا میں علت اور معلول کا واسطہ ہے اور یہی میری سمجھ میں آتا ہے۔ خطا کار کے سر پر تیل چپڑتے میں نے کسی کو نہیں دیکھا۔ مجھے یہ بات غیر قدرتی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے میرے دل میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہوتے ہیں۔

راجہ: دیوی روٹھتی ہیں تو لوگ انہیں مناتے ہیں۔ اس میں غیر قدرتی بات کیا ہے؟

دونوں میں دیر تک سوال و جواب ہوتے رہے۔ مہیندر بہلیے (صیاد) کی طرح دانہ دکھا کر چڑیا کو پھنسانا چاہتے تھے اور چڑیا ڈر کر اڑ جاتی تھی۔ فریب سے فریب ہی پیدا ہوتا ہے۔ وہ اندو کی تشفی نہ کر سکے۔ تب وہ اس کی تکلیف کے رفع کرنے کا کام وقت پر چھوڑ کر ایک خط پڑھنے لگے اور اندو دل پر بوجھ رکھے ہوئے اندر چلی گئی۔

دوسرے روز راجہ صاحب نے روزانہ اخبار کھولا تو اس میں رضا کاروں کی رخصتی کا تذکرہ بہ تفصیل شائع ہوا تھا۔ ضمناً راجہ صاحب کی موجودگی پر بھی رائے زنی کی گئی تھی۔ ''اس موقع پر میونسپلٹی کے صدر راجہ مہیندر کمار سنگھ کی موجودگی ایک خاص اہمیت رکھتی ہے۔ تعجب ہے کہ راجہ صاحب جیسے معاملہ فہم شخص نے وہاں جانا کیوں ضروری سمجھا؟ راجہ صاحب اپنی ذات کو اپنے عہدہ سے جدا نہیں کر سکتے اور ان کی موجودگی گورنمنٹ کو الجھن میں ڈالنے کا سبب ہو سکتی ہے۔ تجربہ نے یہ بات ثابت کر دی ہے۔ سیوا سمتیوں کا آغاز خواہ کتنے ہی نیک ارادوں کو لے کر ہوا ہو لیکن انجام کار وہ بغاوت اور بدامنی کا مرکز بن جاتی ہیں۔ کیا راجہ صاحب اس کا ذمہ لے سکتے ہیں کہ یہ سیوا سمتی بھی آگے چل کر اپنی پیشرو سمتیوں کے نقش قدم پر نہ چلے گی؟

راجہ صاحب نے اخبار بند کر کے رکھ دیا اور خیال میں غرق ہو گئے۔ ان کے منہ

سے بے اختیار نکل گیا، وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا۔ آج کلب میں جاتے ہی جانتے مجھ پر چاروں طرف سے مشتبہ نگاہیں پڑنے لگیں گی۔ کل ہی کمشنر صاحب سے ملنے جانا ہے۔ انہوں نے اس بارے میں کچھ پوچھا تو کیا کہوں گا؟ اس کم بخت اڈیٹر نے مجھے برا چرکا دیا۔ پولیس والوں کی طرح اس فرقہ میں بھی مروت نہیں ہوتی۔ ذرا بھی رعایت نہیں کرتے۔ میں اس کا منہ بند رکھنے کے لیے، اسے خوش رکھنے کے لیے کتنی کوششیں کیا کرتا ہوں۔ ضروری اور غیر ضروری اعلانات چھپوا کر اس کی مٹھیاں گرم کرتا رہتا ہوں۔ جب کوئی دعوت یا تقریب ہوتی ہے تو سب سے پہلے اسے مدعو کرتا ہوں۔ یہاں تک کہ سال گزشتہ میں اسے میونسپلٹی سے انعام بھی دلا دیا تھا۔ انہیں خاطر داریوں کا یہ صلہ ہے۔ کتے کی دم کو سو برس تک گاڑ رکھو، پھر بھی ٹیڑھی کی ٹیڑھی۔ اب اپنی پوزیشن کو کیونکر صاف کروں؟ اس کے پاس جانا تو درست نہیں۔ کیا کوئی حیلہ سوچوں۔

راجہ صاحب بہت دیر تک اسی شش و پنج میں پڑے رہے۔ کوئی ایسی بات سوچ نکالنا چاہتے تھے جس سے حکام کی نگاہوں میں وقار قائم رہے اور ساتھ ہی عوام کی نگاہوں میں بھی، مگر عقل کچھ کام نہ کرتی تھی۔ کئی بار ارادہ کیا کہ چل کر اندو سے اس گتھی کے سلجھانے میں مدد لوں، پر یہ سمجھ کر کہ کہیں وہ کہہ دے کہ حکام ناراض ہوتے ہیں تو ہونے دو۔ تمہیں ان سے کیا سروکار۔ اگر وہ تمہیں دبائیں تو فوراً استعفے دے دو، تو پھر نکلنے کا کوئی راستہ نہ رہے گا۔ اس سے کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑی۔

وہ تمام رات اسی فکر میں ڈوبے رہے۔ اندو بھی کچھ گم سم سی رہی۔ علی الصبح دو چار احباب آ گئے اور انہوں نے اسی مضمون کا تذکرہ کیا۔ ایک صاحب بولے۔ میں کمشنر سے ملنے گیا تھا تو وہ اسی مضمون کو پڑھ رہے تھے اور رہ رہ کر زمین پر پیر ٹپکتے جاتے تھے۔

راجہ صاحب کے ہوش اور بھی اڑ گئے۔ فوراً انہیں ایک تدبیر سوجھ گئی۔ موٹر تیار

کرائی اور کمشنر کے بنگلہ پر جا پہنچے۔ یوں تو صاحب بہادر راجہ صاحب کو ان کا کارڈ پاتے ہی بلا لیا کرتے تھے۔ آج اردلی نے کہا۔ ''صاحب ایک ضروری کام کر رہے ہیں۔ میم صاحب بیٹھی ہیں۔ آپ ایک گھنٹہ ٹھہریں۔''

راجہ صاحب سمجھ گئے کہ آثار اچھے نہیں ہیں۔ وہیں بیٹھ کر ایک انگریزی رسالہ کی تصاویر دیکھنے لگے۔ وہ کتنی صاف اور خوشنما تصاویر ہیں۔ ہمارے رسالوں میں کتنی بھدی تصویریں ہوتی ہیں۔ فضول ہی کاغذ کو لیپ پوت کر خراب کیا جاتا ہے۔ کسی نے بہت کیا تو ملک الشعرا بہار کے جذبات کی بنا پر کسی خوب صورت نازنین کی تصویر بنوا دی اور اس کے نیچے اسی نوعیت کا دوہا لکھ دیا۔ کسی نے پدمان کی کبت پر تصویر بنوا لی۔ بس اس کے آگے کسی کی عقل رسا نہیں ہوتی۔

کسی طرح ایک گھنٹہ گزرا اور صاحب نے بلایا۔ راجہ صاحب اندر گئے تو صاحب کے تیور پر بل پڑے ہوئے نظر آئے۔ ایک گھنٹہ کے انتظار سے جھنجھلا گئے تھے۔ کھڑے کھڑے بولے۔ ''آپ کو فرصت ہو تو میں کچھ کہوں ورنہ پھر کبھی آؤں گا۔''

کمشنر صاحب نے رکھائی سے پوچھا۔ ''میں پہلے آپ سے یہ دریافت کرنا چاہتا ہوں کہ اس اخبار نے آپ پر جو رائے زنی کی ہے، وہ آپ کی نظر سے گذری ہے؟''

راجہ صاحب: جی ہاں دیکھ چکا ہوں۔

کمشنر: آپ اس کا کوئی جواب دینا چاہتے ہیں؟

راجہ صاحب: میں اس کی کوئی ضرورت نہیں سمجھتا۔ اگر محض اتنی سی بات پر مجھ پر شک کیا جا سکتا ہے اور میری سالہا سال کی وفاداری کا کچھ خیال نہیں کیا جاتا تو مجھے مجبور ہو کر اپنے عہدہ سے استعفیٰ دینا پڑے گا۔ اگر آپ خود وہاں جاتے تو کیا اس کی اتنی جرأت ہوتی کہ آپ کے بارے میں بھی اس قسم کی رائے زنی کرتا۔ یہ میرے ہندوستانی ہونے کی سزا ہے۔ جب تک مجھ پر اس قسم کے بے جا حملے ہوتے رہیں

گے، میں نہیں سمجھ سکتا کہ اپنے فرائض کو کس طرح انجام دے سکوں گا۔

کمشنر نے کسی قدر نرمی سے کہا۔ ''گورنمنٹ کے ہر ایک عملہ کا فرض ہے کہ اپنے اوپر ایسے الزامات لگائے جانے کا موقع نہ دے۔''

راجہ صاحب: میں جانتا ہوں۔ آپ لوگ اس بات کو کبھی نہیں بھول سکتے کہ میں ہندوستانی ہوں۔ اسی طرح میرے بورڈ کے رفقاء کے لیے یہ بھول جانا بالکل ناممکن ہے کہ میں حکومت کا ایک رکن ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ میں بورڈ کے سامنے مسٹر جان سیوک کو پانڈے پور والی زمین دیئے جانے کی تجویز پیش کرنے والا ہوں، لیکن جب تک میں اپنے طرز عمل سے یہ بات ثابت نہ کر دوں گا کہ میں نے خود بغیر کسی دباؤ کے صرف رعایا کے مفاد کے لیے یہ تجویز پیش کی ہے، اس وقت اس کی منظوری کی کوئی امید نہیں ہے۔ اسی وجہ سے میں کل اسٹیشن گیا تھا۔

کمشنر کی باچھیں کھل گئیں۔ ہنس ہنس کر باتیں بنانے لگا۔

راجہ صاحب: ایسی حالت میں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میرا جواب دینا ضروری ہے۔

کمشنر: نہیں نہیں۔ ہرگز نہیں۔

راجہ صاحب: مجھے آپ سے پوری مدد ملنی چاہیے۔

کمشنر: میں حتی الامکان آپ کی مدد کروں گا۔

راجہ صاحب: بورڈ نے منظور بھی کر لیا تو محلّہ والوں کی طرف سے فساد کا اندیشہ ہے۔

کمشنر: کچھ پروا نہیں۔ میں سپرنٹنڈنٹ پولیس کو تاکید کر دوں گا کہ وہ آپ کی مدد کرتے رہیں۔

راجہ صاحب یہاں سے چلے تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا آسمان پر چل رہے ہیں۔ یہاں سے وہ مسٹر کلارک کے پاس گئے اور وہاں بھی اسی حکمت سے کام لیا۔ دوپہر کو گھر آئے۔ ان کے دل میں یہ خیال کھٹک رہا تھا کہ اس بہانہ سے میرا کام تو نکل